51

سورۂ فاتحہ کی لطیف تفسیر

(فرمودہ ۲۵ جنوری ۱۹۲۴ء)

تشہد و تعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا

میں بوجہ گلے کی تکلیف کے زیادہ نہیں بول سکتا۔ لیکن چونکہ خطبہ جمعہ ہی ایک ایسا موقع ہوتا ہے۔ جس میں اردگرد کے دوست اکٹھے ہوتے ہیں۔ اور بعض باتوں کے سننے کا ان کو موقع ملتا ہے۔ اس لئے میں خود ہی اختصار کے ساتھ خطبہ پڑھانے کے لئے کھڑا ہو گیا ہوں۔

میرا یہ طریق ہے کہ ہمیشہ اور اگر ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھی رہ جاتا ہو گا۔ لیکچر یا خطبہ سے پہلے سورۂ فاتحہ پڑھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ سورۃ ان تمام امور پر مشتمل ہے۔ جن کی طرف اسلام متوجہ کرتا ہے۔ اس سورۃ کا ایک ایک لفظ اپنے اندر وسیع مطالب رکھتا ہے۔ اور جیسا کہ ایک عرصہ سے مسلمانوں کا خیال چلا آتا ہے قرآن کریم کی تعلیم کا خلاصہ اس میں بیان کیا گیا ہے اس سورۃ کو اللہ تعالیٰ نے بسم اللہ کے بعد جو کہ تمام سورتوں کی کنجی ہے اور سورۂ فاتحہ سے اس کو خصوصیت نہیں۔ الحمد للہ سے شروع فرمایا ہے۔ اور **غیر المغضوب علیھم و لا الضالین** پر ختم کیا ہے۔

بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص حمد سے کام شروع کرتا ہے وہ **مغضوب علیھم** اور ضال جماعت میں پڑنے کے خطرے میں کیونکر پڑ سکتا ہے۔ ایک ایسا کامل الایمان کہ جو ساری خوبیاں خدا کے لئے سمجھتا ہو اور جسے خدا کے سوا کسی ذات میں خوبی کا خیال نہ ہو کیونکہ حمد کا لفظ مصدر ہے اور یہ صیغہ معروف و مجہول کا مصدر ہے۔ پس حمد کے معنے ہیں حمد کرنا اور کیا جانا۔ جب انسان الحمد للہ کہتا ہے تو وہ اقرار کرتا ہے کہ نہ تو مجھ میں یہ طاقت ہے کہ کسی کی حمد کر سکوں اور نہ خود کسی حمد کا مستحق ہوں۔ اور میرے علاوہ جو مخلوق ہے۔ وہ بھی مستحق نہیں کہ اس کی حمد کی جائے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ایسا سمجھتا ہے۔ جو حمد کی مستحق ہے۔ اور جو کسی کی حمد کر سکتی

ہے۔

اب دیکھو کہ انکسار اور کس حد تک انکسار تذلل اور کس حد تک تذلل ہے۔ کہ انسان اپنی ہستی کی بھی نفی کر دیتا ہے۔ اور اپنے اندر کسی بھی ہنر اور خوبی کو نہیں دیکھتا۔ ایسا انسان اقرار کرتا ہے کہ مجھ میں حسن ذاتی نہیں۔ نہ کسی غیر میں ذاتی حسن ہے۔

دنیا میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ علم یا حقیقت کسی چیز میں کوئی حقیقت ہو گی یا کسی شخص کو اس حقیقت کا علم ہو گا۔ یہی دو باتیں ہیں کہ جو کسی چیز کو تعریف کا مستحق بناتی ہیں۔ مثلاً کونین تعریف کی مستحق ہے۔ کیونکہ اس میں طاقت ہے کہ بعض قسم کے بخاروں کو دور کر دیتی ہے۔ لیکن ایک ڈاکٹر بھی قدر کئے جانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ کونین سے فلاں فلاں قسم کے بخاروں میں آرام ہوتا ہے۔ یا لکڑی اور لوہا قدر کی چیزیں ہیں کہ ان سے عمارتیں تیار ہوتی ہیں۔ جہاز بنائے جاتے ہیں۔ مگر ایک بڑھئی۔ ایک لوہار اور ایک معمار بھی قابل تعریف ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ لکڑی لوہے۔ اینٹ پتھر سے کس طرح کام لیا جاتا ہے۔

پس جتنی حقیقتیں ہیں۔ وہ دو قسم کی ہیں۔ یا تو کسی میں کسی خوبی کا ہونا۔ یا اس خوبی کا علم ہونا۔ انسان الحمد للہ کہہ کر تسلیم کرتا ہے۔ کہ کسی میں کوئی خوبی نہیں۔ مگر خدا میں ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ ہی کی ذاتی خوبی ہے۔ یہ کمال تذلل اور کمال انکسار ہے۔ گویا بندہ اپنے وجود سے ہر ایک خوبی کا انکار کر دیتا ہے۔ اور پھر تمام مخلوقات کو دیکھتا ہے کہ اس میں اسے وہ خوبی نظر نہیں آتی۔ جس کو وہ خدا کے مقابلہ میں قابل تعریف کہہ سکے۔ اس طرح وہ تمام مخلوق پر نظر کرنے کے بعد کہتا ہے۔ خدا کے سوا کسی میں کوئی خوبی نہیں۔

اس عظیم الشان ابتداء کے بعد جو الحمد للہ سے ہوتی ہے کہتا ہے۔ **غیر المغضوب علیھم و لا الضالین** کہ خدایا مجھ پر غضب نہ نازل کرنا اور ایسا نہ ہو کہ میں تیری رضا کی راہ سے بھٹک جاؤں۔

لوگ کہتے ہیں۔ اور سچ کہتے ہیں کہ علم و معرفت سے انسان ہلاکت سے بچتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ جس جنگل میں شیر ہو وہاں کوئی نہیں جاتا۔ یا جس جنگل میں ڈاکہ پڑتا ہو وہاں سے لوگ بغیر حفاظت کے نہیں گذرتے۔ پھر باوجود عرفان حاصل ہونے کے سمجھ میں نہیں آتا کہ **غیر المغضوب علیھم و لا الضالین** کیوں فرمایا۔ عرفان کے بعد غضب اور ضلالت کا کیا خوف۔ مگر میں کہتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ عرفان کے بعد اس کا خوف نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ عرفان کھویا بھی جاتا ہے۔ پس اعلیٰ سے اعلیٰ عرفان اور علم کسی کو مطمئن نہیں کر سکتا کہ وہ غضب اور

ضلالت سے بالکل مصئون ہو گیا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص کو عرفان اور علم ہو۔ مگر وہ اس سے چھینا جائے یا کھویا جائے۔

دنیا میں دیکھ لو۔ ایک انسان دوسرے کو ملتا ہے۔ اس حال میں کہ وہ دونوں ایک لمبا عرصہ جدا رہتے ہیں۔ جب وہ ملتا ہے۔ تو کہتا ہے آپ نے مجھے پہچانا۔ وہ کہتا ہے۔ نہیں۔ تو وہ کہتا ہے کہ میں اور آپ اکٹھے کھیلتے اور پڑھتے رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ابھی تک میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بہت کچھ تعارف سابقہ کی باتیں بتانے کے بعد بھی ایک شخص یہی کہتا ہے کہ افسوس میں نے آپ کو اب تک نہیں پہچانا۔ اس سے ثابت ہوا کہ علم اور عرفان مٹائے بھی جاتے ہیں۔

اور اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص مخلص تھا۔ بڑا خادم تھا۔ اس کو کیونکر ٹھوکر لگ گئی۔ اس کو ٹھوکر اسی وقت لگتی ہے جب اس کا اخلاص کھویا جاتا ہے یا مٹ جاتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحیح راستہ معلوم ہونے کے باوجود لوگ راستہ سے ہٹ بھی جایا کرتے ہیں۔ محبت کو اختیار کر کے بھول بھی جایا کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ **و من نعمّرہ ننکّسہ فی الخلق** (یٰس : ۶۹) جب عمر بڑھتی ہے تو قویٰ میں کمزوری آجاتی ہے۔ پس جس طرح عمر میں بڑھاپا آنے سے علوم میں کمی آجاتی ہے اس طرح بعض انسانوں پر روحانی طور پر بھی بڑھاپا آجاتا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی عارف یا عالم جو الحمد للہ کہنا جانتا ہو۔ مگر پھر اس سے اس کی حقیقت گم ہو جائے۔ وہ مغضوب علیہم میں شامل ہو سکتا ہے۔

سورۂ فاتحہ میں یہ بات بتا کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ کسی کی ٹھوکر سے کوئی ٹھوکر نہ کھائے۔ اور کسی کے گرنے سے کوئی نہ گرے۔ جب تک کسی شخص کے متعلق خدا نہ کہدے کہ یہ شخص غلطی سے محفوظ ہو گیا۔ اور اب یہ ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔ تب تک کسی شخص کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شخص منزل مقصود پر پہنچ گیا اور ایسے لوگ جن کو غضب اور ضلالت سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ وہ خدا کے انبیاء ہوتے ہیں وہ بچے کی طرح خدا کی گود میں ہوتے ہیں۔ خدا ان کے وجود کو اپنا وجود قرار دے دیتا ہے ان پر اپنی الوہیت کی چادر ڈال دیتا ہے۔ ان میں خدا کی الوہیت تو نہیں آجاتی۔ مگر وہ خدا کے مظہر ہو جاتے ہیں۔ ان کی تعریف سچی تعریف اور ان کی حمد سچی حمد ہوتی ہے ان کے علاوہ کوئی شخص ایسا نہیں ہوتا۔ جس کے متعلق کہا جائے۔ کہ وہ ٹھوکر کیوں کھا گیا۔

ایک شخص کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر کسی شخص نے جنتی دیکھنا

ہو۔ تو اس شخص کو دیکھ لے یہ کہہ کر آپ نے ایک شخص ایسے کی طرف اشارہ فرمایا جو لڑائی میں کفار سے بڑی سرفروشی سے لڑ رہا تھا ایک صحابی کہتے ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ بعض لوگوں کو اس بات سے ابتلاء نہ آ جائے کہ ایک ایسے مخلص شخص کو جہنمی کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اس طرح لڑ رہا تھا کہ مسلمان کہہ رہے تھے کہ خدا تعالیٰ اس کو جزائے خیر دے۔ وہ صحابی اس کے پیچھے ہو لئے۔ آخر وہ زخمی ہوا۔ اس نے رونا شروع کیا۔ صحابہ آ کر کہتے تجھے جنت کی بشارت ہو۔ مگر وہ کہتا کہ تم مجھے جنت کی بشارت نہ دو۔ بلکہ جہنم کی بشارت دو۔ کیونکہ میں خدا کے لئے نہیں اپنے نفس کے لئے لڑ رہا تھا۔ آخر جب وہ درد سے بے تاب ہو گیا۔ تو اس نے اپنا نیزہ گاڑا اور اپنا پیٹ اس پر رکھ کر ہلاک ہو گیا۔ اس طرح خودکشی کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ جہنمی تھا پس کسی شخص کی حالت محفوظ نہیں ہوتی۔ جب تک کہ خدا تعالیٰ اس کے وجود کو اپنا وجود نہ کہہ دے اور اس کی یہ حالت نہ ہو جائے۔

من توشدم تو من شدی من جان شدم تو تن شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

پس کتنا ہی مخلص اور کتنی ہی خدمت کرنے والا کوئی ہو۔ یہ کہنا کہ وہ ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔ درست نہیں۔ ہماری جماعت کے بعض لوگوں نے اس لئے ٹھوکر کھائی ہے کہ پیغامیوں میں ایسے لوگ مل گئے۔ جو بڑے مخلص اور خدمت گذار تھے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ بے شک انہوں نے خدمتیں کیں مگر یہ بھی تو ظاہر ہے کہ علم و عرفان چھینے بھی جاتے ہیں۔ اور کھوئے بھی جاتے ہیں۔ ان کے متعلق ایسا ہی ہوا۔

دوسرا نکتہ جو اس سورۃ میں قابل لحاظ ہے۔ وہ خوف و رجا کی حالت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ۲ اور قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ کہ ایمان خوف اور رجا میں ہے۔ اور ایمان کی حقیقت خوف و رجا کے درمیان ہے۔ سورۂ فاتحہ بھی اسی کی طرف رہبری کرتی ہے۔ الحمد للہ کہہ کر رجاء پیدا کی ہے۔ اور غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہہ کر خوف سامنے آ جاتا ہے۔ یہ راستہ ہے جس پر مسلمان چلتا ہے اور یہی پل صراط ہے جس کے ایک طرف بہشت ہے اور ایک طرف دوزخ۔ ایمان اسی پل پر چلنے سے مکمل ہوتا ہے۔ پس خواہ کسی میں کتنا ہی اخلاص ہو۔ اس کے لئے بھی ان دونوں باتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

پس میں نصیحت کرتا ہوں کہ ہماری جماعت کے لوگ تمام کاموں میں اس نکتہ کو نہ بھولیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا عرفان دے۔ تا اس کی طرف سے جو علوم آتے ہیں۔ ان کو ہم حاصل کریں اور پھر وہ ہم سے نہ چھینے جائیں۔ اور نہ ہم ان کو کھوئیں اور ہمارا ایمان خوف و رجاء کے درمیان رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام سستیوں سے بچائے۔ جو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور ان راہوں پر چلائے جو جنت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور ان میں سے بنائے۔ جن کو جنت اسی دنیا میں مل جاتی ہے۔ جب تک یہ مقام حاصل نہ ہو۔ تب تک ہلاکت کا خوف ہے۔ لیکن اس مقام کے آگے ہلاکت نہیں۔ بلکہ کامیابی ہی کامیابی ہے۔

(الفضل یکم فروری ۱۹۲۴ء)

ل بخاری کتاب القدر باب العمل بالخواتیم
۲ بخاری کتاب الرقاق باب الرجاء مع الخوف